بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

معاشرے کو اسلام کی بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے اوّل درجے کی اہمیت نظامِ تعلیم کی تبدیلی کو حاصل ہے۔

مگر ہر دوسرے دائرے کی تبدیلی کی طرح نظامِ تعلیم کی تبدیلی کے بھی کچھ خاص مسائل ہیں جو خصوصی توجہ چاہتے ہیں۔

پہلا مسئلہ بڑا اصولی قسم کا ہے وہ یہ کہ ایک صورت جزوی ترمیمات اور تبدیلیوں کی ہوتی ہے۔ اور ایسا اکثر ہوتا ہی رہتا ہے۔ اس کے لیے کسی بڑے اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دوسری صورت پورے نظام کو نئی بنیادوں پر از سرِ نو استوار کرنے کی ہے۔ یہ ایک بھاری اور وسیع کام ہے اور اسے انجام دینے کے لیے بہت سی ضروریات ہیں جن کو اگر صحیح طور سے پورا نہ کیا جائے تو منزلِ مراد نہیں ملتی۔

ہماری مشکل یہ ہے کہ ہمارے سامنے تبدیلی کا پروگرام تو بنیادی اور جامع قسم کا ہے، مگر مردانِ کار زیادہ تر ایسے ہیں جو جزوی ردّ و بدل کے لیے موزوں ہیں۔

ایسے احوال میں جو کام ہوتا ہے اس میں طرح طرح کی اُلجھنیں موجود رہتی ہیں اور معاشرے میں وہ اطمینان پیدا نہیں ہوتا جس کے لیے سارا کام کیا جاتا ہے۔

اب تک تعلیم کے دائرے میں جو کچھ ہوا ہے اُس کی قوتِ محرکہ ہمارے ان مفکرین کی کاوشیں ہیں جنہوں نے اسلامی نظامِ تعلیم کی اُمنگ پیدا کی ہے۔ پڑھے لکھے حلقوں کو انہوں نے دلائل سے

قائل کیا ہے اور عام لوگوں میں ایک جذباتی طلب نمودار ہوتی ہے۔ مفکرین کے کام کو اہل صحافت ارباب سیاست، اور اصحاب خطابت نے آگے بڑھایا اور تعلیمی تبدیلی کے مطالبے کو عوامی دائروں تک پہنچایا۔ فطرتی بات تھی کہ جوں جوں نظام اسلامی کے لیے تحریک بڑھتی جائے، ساتھ کے ساتھ نظام تعلیم کی تبدیلی کی خواہش بھی زور پکڑے۔ چنانچہ ۱۹۷۷ء میں اٹھنے والی قومی اتحاد کی طوفانی تحریک کے ابھار کے بعد تعلیمی انقلاب کا جذبہ عام ہوگیا۔ آج سیاسی جماعتیں، مذہبی گروہ، اساتذہ کے حلقے اور طلباء کی تنظیمیں اور اخبارات وجرائد کا بیشتر حصہ اسلامی نظام تعلیم کو جلوہ گر دیکھنے کے لیے بے چین ہیں۔

یہ دباؤ خاصی حد تک پہلے بھی موجود تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ دَورِ ایوبی میں ایک نئی تعلیمی پالیسی بنی، مگر وہ عملاً بے اثر ثابت ہوئی۔ پھر ایک نئی پالیسی بھٹو صاحب کے دَور میں نمودار ہوئی اور اس کے مطابق نصابیات کی تدوین بھی ہوئی، مگر وہ نہایت ناقص اور ناقابل اطمینان تھی۔ اب پھر ایک پالیسی بن کر سامنے آئی ہے جس میں اگرچہ بعض پہلو بہت خوش آئند ہیں۔ اور پہلے کے مقابلے میں اسلام کے حق ایسی صراحتیں اس میں آگئی ہیں جن کی مثال پہلے کی پالیسیوں میں نہیں ملتی سابق پالیسیوں میں اسلام کی بات کرتے ہوئے، اسلام سے گریز کی ذہنیت کارفرما تھی اور صرف پالیسی کی سطح کو خوشنما بنانے کے لیے اسلامی رنگ کی وارنش استعمال کی جاتی تھی۔ اب کے اسلام سے گریز کی وہ صورت نہیں ہے۔

مثلاً تعلیم کے مقاصد یا غایات کے متعلق جو اوّلین کلمات کہے گئے ہیں وہ خاصے قابلِ تحسین ہیں۔ صاف طور پر کہا گیا ہے کہ ہمارے تعلیمی مقاصد کو ہمارے ایمان وعقیدے (یعنی دین) کے مطابق ہونا چاہیے۔ نیز قومی نظریات اور امنگوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ اس اصول کے تحت نقشۂ کار بہت ممیز اور بدیہی ہونا چاہیے۔ اور اسے جرأت مندی اور نیتوں کی صفائی کے ساتھ تشکیل دیا جانا چاہیے تاکہ ملک کی تعلیمی مساعی کو ایک مضبوط اور جاندار بنیاد فراہم ہوسکے۔ ملک کے باشندوں، خصوصاً طلباء کے قلوب واذہان میں اسلام کے لیے ایک گہری اور پائیدار وفاداری پیدا کی جاسکے، اور مسلم قومیت کا ایک زندہ شعور ان میں کارفرما ہو۔ ہر طالب علم میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ وہ دنیا بھر میں پھیلی ہوئی اُمتِ مُسلمہ کا ایک حصہ ہے۔ جس کے طرزِ فکر میں وحدت

پیدا کرنے کے لیے اُسے اپنا حصّہ ادا کرنا ہے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ اس کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ پوری دُنیا میں دعوتِ اسلامی کو پھیلانے کا ذریعہ بنے۔ میں قرآن وسنت کے تقاضوں کے مطابق اخلاق و کردار کو نشوونما دی جائے اور قول و عمل کے درمیان فاصلوں اور خلیجوں کو پاٹ کر ان میں ایسا ولولۂ عمل پیدا کیا جائے جس کی توقع سچے مسلمان سے کی جاتی ہے۔ ان میں ایسی قابلیت وصلاحیت پیدا کی جائے کہ سماجی، قدرتی اور پیداآور قوتوں کا مؤثر انضباط اسلام کے نظامِ اقدار کے مطابق کر سکیں۔

تعلیمی مقاصد کا یہ ملخص میں نے اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے۔ یہ پچھلی تمام کوششوں سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ اور اس کا کریڈٹ اوّلاً چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاءالحق کو، اور بعدازاں قومی اتحاد کے لیڈروں اور کارکنوں، نیز اسلامی کونسل اور اسلام آباد تعلیمی کانفرنس سب کو جاتا ہے۔

مقاصد کے بیان میں اگر کوئی کمی ہے تو یہ ہے کہ اس میں ویسا انقلابی داعیہ کارفرما نہیں جس کا تقاضا اسلام کی صحیح تعبیر کرتی ہے اور جس کی مثال دورِ حاضر میں ایک مخالفِ اسلام تحریک یعنی اشتراکیت میں پائی جاتی ہے۔

اشتراکی پالیسیاں خواہ مزدوروں اور کسانوں سے متعلق ہوں، سائنس دانوں اور مصنفوں سے متعلق ہوں، سپاہیوں اور انجینیروں سے متعلق ہوں، یا تعلیم اور نشریات سے متعلق ہوں، ہر شعبے میں کام کرنے والوں کو یہ شعور دلایا جائے گا کہ تم ایک انقلاب کے علمبردار سپاہی ہو اور تمھیں ساری دُنیا میں یہ انقلاب برپا کرنا ہے۔

ہمارے ملی تعلیمی پالیسی کو تشکیل دینے والے فاضل حضرات میں اگرچہ طرح طرح کی علمی وتحقیقی قابلیتیں اور ٹکنیکل مہارتیں جمع ہیں، مگر اُن کے ذہنوں میں انقلابیت موجود نہیں ہے۔ تجدید واحیائے اسلام کا کام تعلیم کے حلقے سے لے کر پوری زندگی کے وسیع دائرے تک سرانجام دینے کے لیے ایمانی انقلابیت کی ضرورت ہے۔ یہ انقلابیت اگر موجود ہوتی تو تعلیمی پالیسی میں ہم اس کی جھلک ضرور دیکھتے۔ موجودہ تعلیمی پالیسی میں جہاں دنیا بھر میں اُسلام کا پیغام پھیلانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہاں بات بہ انداز دگر ہوتی اور طالب علم سے کہا جاتا کہ تم اسلامی انقلاب کے علمبردار اور خدا کے سپاہی ہو۔ تمھیں ساری دنیا کو اس پر

تیار کرنا ہے کہ تمام قومیں اپنے اپنے یہاں اسلامی انقلاب برپا کریں۔

یہ نقطۂ نظر نہ صرف نئے نظام تعلیم کو مؤثر بنا دیتا، بلکہ نوجوان طلبہ کے دلوں کو ایسی حرکت و حرارت سے مالا مال کر دیتا کہ وہ اپنے آپ کو تبدیل کرنے میں بھی لگن دکھاتے اور ساری انسانیت کو اسلام کے پاکیزہ، فلاحی اور تعمیری انقلاب کا راستہ دکھانے کی بھاری ذمہ داری کے لیے تیاری بھی کرتے۔

غالباً یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ لفظ انقلاب کے معنی مار دھاڑ خون خرابے کے ہیں۔ حالانکہ اس اصطلاح کو یہ مفہوم تو اشتراکیوں کے عملی تجربوں نے دیا ہے۔ اصلاً انقلاب کا بنیادی تصور یہ ہے کہ جزوی تبدیلیوں کے بجائے جامع تبدیلی مطلوب ہو، دوسرے یہ کہ اس کے لیے بھرپور جدوجہد کی جائے اور تیسرے یہ کہ مزاحم قوتوں اور مخالف رجحانات سے سمجھوتے کرنے کے بجائے ان کا مقابلہ کیا جائے، نیز کرنے کے کام ادھورے یا ادھ کچرے طریق سے نہ کیے جائیں۔ بلکہ اصول و معیار کے مطابق کیے جائیں۔

دوسرا مفہوم انقلابی نقطۂ نظر کا یہ ہوتا ہے کہ جب کام کر رہا ہو تو آدمی کی سوچ بچار یوں ہوتی ہے کہ مجھے فلاں کام فلاں طریق سے مزور کرنا ہے، اور وہ اگر کچھ کرنے کا موقع پاتے تو پھر کسر نہیں چھوڑتا۔ وہ حالات کو مجبور کرتا ہے کہ ساز گار ہوں، رکاوٹیں دُور ہوں۔ مزاحمت کرنے والے لوگوں کو خوش اسلوبی سے، یا قوت سے درست کر لیتا ہے۔ ذہن انقلابی نہ ہو تو آدمی مصلحتوں اور اندیشوں میں گھرا رہتا ہے اور ہر مزاحم قوت کو دیکھ کر ٹھٹک جاتا ہے۔

ہماری تازہ ترین تعلیمی پالیسی کے پیچھے انقلابی ذہن کا کارفرما نہ ہونا اسے کمزور کر دیتا ہے۔

پچھلی گفتگو کی روشنی میں اسی تعلیمی پالیسی کے ایک خصوصی باب کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔

اگرچہ ایک زور دار پیراگراف سائنسی تعلیم کے متعلق لکھا گیا ہے، مگر واضح تعلیمی مقاصد کے رُو سے نقطۂ نظر کی جو تبدیلیاں سائنس کی تدریس و تعلیم میں آنی چاہییں ان کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ مقاصد کو مختلف ابواب میں ہم دخیل نہیں دیکھتے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ تمام ابواب کے نوٹس الگ الگ لکھے گئے ہیں۔ اور ان پر مقاصد والا نوٹ چسپاں کر دیا گیا ہے۔

مثلاً سائنس کی تدریس اور نصابی تدوین میں جس زاویۂ نگاہ (APPROACH) سے اسلامی نظامِ تعلیم میں کام لینا ہے اور وہ یہ ہے کہ سائنس کی تمام کاوشوں، تجربوں اور انکشافات و اکتشافات کا مدعا کائنات و حیات میں کارفرما نوامیسِ الٰہی یا سنت اللہ کو معلوم کرنا ہے۔ اشیاء اور قوتوں کے متعلق سننِ الٰہیہ کا علم جتنا جتنا بڑھے گا، اتنا ہی ہم خدا کے پیدا کردہ مادی وسائل یا متاعِ دنیوی سے زیادہ استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس ایمانی تصور کے تحت اب بات اس طرح پیش نہ کی جائے گی کہ یہ نیوٹن کا قانون ہے اور وہ جان ڈیوی کا یا آئن سٹائن کا، بلکہ اب نیا پیرایۂ بیان یہ ہوگا کہ جان ڈیوی یا نیوٹن نے فلاں فلاں قانونِ الٰہی کو دریافت کیا۔ اسی طرح یہ کہا جائے گا کہ فلاں عالم نے فلاں دائرے میں قانونِ الٰہی کا جو تصور اخذ کیا تھا، اسے بعد کے کسی محقق نے غلط ثابت کر دیا ہے اور اب سنت اللہ کے متعلق ہماری معلومات یہاں تک پہنچی ہیں۔ وغیرہ

ہر چیز متاع ہے، ہر چیز خدا کی امانت ہے۔ ہر چیز خدا کے قوانین کے تحت کام کرتی ہے، اور ہر چیز سے استفادہ کرنے کے لیے خدا کی سنت کو معلوم کرنا ضروری ہے۔ اور ہر چیز سے ان حدود میں کام لیا جائے گا جو اللہ تعالیٰ نے مقرر کی ہیں۔

پھر سائنس کی تدریس میں ہمیں اپنے طالب علم کو اس احساس کہتری سے نکالنا ہے کہ سائنس بس اہل مغرب کا عطیہ ہے۔ ہمیں اس کا سرا ایک طرف تاریخِ بعید میں تلاش کر کے دکھانا ہے کہ انسانیت شروع سے سائنس کے علم اور اس کے دائرہ استعمال میں اضافہ کرتی آئی ہے۔ دوسری طرف ہمیں اپنے طالب علم کے سامنے یہ حقیقت بھی رکھنی ہے کہ ہمارے اسلاف نے سائنس کا بہت سا سفر طے کیا۔ انہوں نے ایجادات کیں، علوم کی بنیاد رکھی۔ لیکن بعد میں جب ان کے اندر اسلام کی انقلابی تحریک کے دیے ہوئے جذبے میں کمی آگئی تو ان کا سیاسی اقتدار اور اقتصادی تفوق ختم ہوا اور اس کے ساتھ سائنس کی راہ پر بھی ان کی پیش قدمی رک گئی۔ بعدازاں ان کی یونیورسٹیوں سے پڑھ کے جانے والے اُن کے شاگردوں نے مذہبی، سیاسی، معاشی و سماجی دائرے میں بھی اور سائنس اور تعلیم کے دائرے میں بھی سرگرمی سے کام شروع کیا۔ دراصل مغرب نے مختلف علوم اور سائنس کی جو عمارت بلندیوں تک پہنچا دی ہے اس کی بنیادیں مسلمانوں نے رکھی تھیں اور اس بنا پر ہم دورِ جدید کی سائنسی ترقیات میں حصہ دار ہیں۔ ساتھ ہی طلبا میں یہ جذبہ پیدا کیا جائے

کہ اب انہیں اپنے اسلاف کی عظمت کا احیا کرنا ہے اور دوسرے دائروں کے ساتھ ساتھ سائنس کے سفر کو از سرِ نو جاری کرنا ہے۔ یہ مہم نہ صرف اقتصادی اور دفاعی لحاظ سے ضروری ہے، بلکہ بین الاقوامی وقار کے لیے لازم ہے۔

اسی طرح خواتین کی تعلیم کے باب میں کوئی اشارہ نہیں اُن کے اس اختصاصی مقام کے متعلق جو خدا ورسولؐ نے واضح اور قطعی انداز میں متعین کیا ہے۔ بخلاف اس کے مغربی تہذیب نے اپنے سیکولر اصولوں اور انسان کے حیوانی تصور کے تحت اُن کے لیے جو طرز و اسلوب رائج کیا ہے، اُس سے آگے سوچنے کی جرأت مسلم معاشروں میں نہیں ہے۔ آج بھی یہ خطرا باقی ہے کہ کہیں کسی جداگانہ طرزِ فکر کی وجہ سے ہمیں قدامت پسند اور پسماندہ نہ قرار دے دیا جائے۔ اِس خود مسلط کردہ غیر اختیاری دباؤ کے زیر اثر ہم یہ بات فخر اور احساس برتری کے ساتھ کہنے کی تاب نہیں رکھتے کہ عورت کو ترقی کے نام پر جس پستی میں مغرب نے لا ڈالا ہے، ہم اپنی خواتین کے لیے اسے پسند نہیں کرتے۔ اگر واقعی مطلوب اسلام ہے تو پردہ (خواہ اس کا کم سے کم درجے کا فقہی تصور سامنے رکھا جائے) کا قانون لازم ہے۔ گھروں کے باہر صنفین کا بے محابہ قسم کا اختلاط (FREE MIXING) درست نہیں ہے۔ گھر کے ادارے کا تحفظ اور بنیادی انسانی رشتوں اور روابطوں کا استحکام مطلوب ہے، نئی نسل کو پوری مادری توجہ کی فراہمی ضروری ہے۔ نسائیت کے وقار و احترام کی کڑی حفاظت موجودہ دَور کی کاروباریت اور دولت پرستی اور جنسی ہیجانات کے مقابلے میں شدید طور پر اہم ہے۔ خواتین کی تعلیم کا مسئلہ اسلام کے ان بنیادی تصورات کے فریم میں رکھ کر زیرِ غور لانا چاہیے۔

اس کے لئے نظامِ تعلیم میں لازمی طور پر خواتین کے لئے جداگانہ تعلیمی اداروں کا انتظام ہونا چاہیے اور مخلوط تعلیم کو یکسر ختم کر دینا چاہیے۔ پہلے جو تعلیمی مدارج (TIERS) تھے ان کے لحاظ سے معاشرے کا یہ مطالبہ تھا کہ یونیورسٹیوں کی سطح پر خواتین کے لئے تعلیمی انتظام جداگانہ ہو۔ چنانچہ خواتین یونیورسٹی کا آوازہ نیچے ہی سے نہیں اوپر سے بھی سنائی دیا۔ اور ملک میں اس کی گونج بڑی مسرت سے محسوس کی گئی۔ اب تعلیمی مدارج (TIERS) کی نئی تقسیم کی صورت میں، ہم یہ کہیں گے کہ نویں جماعت

سے جو آئندہ انٹرمیڈیٹ کالجوں کا حصہ ہوگی، خواتین کی تعلیم کے لئے الگ غیر مخلوط ادارے قائم کئے جائیں۔ بدقسمتی سے آہستہ آہستہ خواتین یونیورسٹی کا آوازہ عملی اقدام نہ ہونے کی وجہ سے دبتا چلا گیا اور نئی پالیسی نے تو گویا اسے بالکل مدفون کر دیا ہے۔ خصوصاً نئے مدارج تعلیم کی تقسیم خاصی پیچیدہ صورت حالات پیدا کرنے کا باعث ہوگی۔

میں کہتا ہوں کہ جس تعلیمی پالیسی کے بنیادی مقاصد میں واضح طور پر ایک مقصد یہ بھی رکھا گیا تھا کہ طلبہ کی زندگیوں میں قول و عمل کے فاصلوں کو ختم کرنا ہے۔ وہ پالیسی خود اسلامیت کے دعوے سے تضاد رکھتی ہے۔

اگر تعلیمی دانشوروں میں خدا اور رسول کے لئے حقیقی ایمان موجود ہے تو انہیں یا تو جرأت سے مغربیت اور سیکولرازم کے بنائے ہوئے طلسمِ ترقی کو توڑ کر خواتین کی تعلیم کا جداگانہ انتظام کرنے کا اعلان کرنا چاہئے، اور یا اس پالیسی میں یہ لکھ دینا چاہئے کہ اسلام کے جو تقاضے خواتین کی تعلیم کے متعلق ہیں وہ ہم پورے نہیں کر سکتے۔

بہرحال نئی تعلیمی پالیسی کے پیچھے حقیقی انقلابی ذہن کارفرما نہیں ہے۔

انقلابی ذہن وہ ہوتا ہے جو کسی بھی تبدیلی کے لئے برسوں سوچ بچار کرتا ہے۔ غلط حالات پر مضطرب ہوتا ہے، صحیح نقشے کے کارفرما ہونے کے لئے دعوت دیتا ہے، متعلقہ سوالات اور الجھنوں کو حل کرتا ہے، اس کے اندر دانش وری کے ساتھ ساتھ ایک ایمانی شعور اور انقلابی جذبہ موجود ہوتا ہے۔

یہاں چونکہ اسلامی جذبہ، انقلاب کے ساتھ مسئلہ تعلیم پر سوچنے والے ذہن پس منظر میں ہیں، اور جن لوگوں کو تعلیمی سندات اور عہدوں کی وجہ سے نیا نقشہ تعلیم بنانے پر لگایا گیا تھا، وہ نہ تو انقلابی دردمندی رکھتے ہیں، نہ ویسی حرکت و حرارت۔ وہ محض ٹیکنیکل ماہرین ہیں۔ وہ ایک کمپیوٹر کی طرح کام کر سکتے ہیں۔ آپ نے کہا کہ فلاں تبدیلی مطلوب ہے، انہوں نے انجینئرز کی طرح اس کا خاکہ مرتب کر دیا یہ خاکہ بڑا وقیع ہے۔ ان کی پالیسی بڑی شاندار ہے۔ مگر سارے نظامِ تفکر کی رگوں میں گردش کرنے والا وہ خون نہیں ہے جو ہونا چاہئے۔ بلکہ ستم ظریفی یہ بھی ہے کہ ایسے ماہرین بھی اس "اسلامی مہم" میں شریک رہے ہیں جو بنیادی طور پر اس بات کے مخالف ہیں کہ یہاں ہر مسئلے کی کوئی مکمل اور صحیح (باقی بر صفحہ ۴۴)